پاس گزر تک نہیں ہو سکتا...... یہی بات ایک موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے فرمائی تھی کہ۔

وَاعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّةَ لَوِاجْتَمَعَتْ عَلٰى اَنْ يَّنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ وَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰى اِنْ يَّضُرُّوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ ...... (ترمذی)

"اس حقیقت کو پلے باندھ لو کہ تمام انسان مل کر تمہیں کوئی نفع پہنچانا چاہیں، نہیں پہنچا سکتے مگر اتنا جو اللہ نے لکھ دیا ہو۔ اور تمام انسان مل کر تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہیں، نہیں پہنچا سکتے مگر وہ جسے اللہ نے طے کر دیا ہو۔"

لہٰذا جب ایمان وایقان کی کیفیت یہ ہو تو پھر خوف و حزن قریب نہیں پھٹک سکتے۔ یہ طمع اور خوف انسان میں بزدلی پیدا کرتا ہے۔ اگر توحید کامل ہوگی تو اللہ کے سوا کسی سے نہ طمع ہوگی اور نہ کسی سے خوف ہوگا۔ درحقیقت یہ توحید کی کمی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے خوف ہوتا ہے، بزدلی پیدا ہوتی ہے، انسان طرح طرح کے وساوس میں مبتلا ہوتا ہے اور اس سے کمزوری کا ظہور ہوتا ہے۔ اسی لئے بڑے تاکیدی انداز میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے توسّط سے اہل ایمان سے فرمایا گیا۔ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

لیکن اگر یہاں یہ مفہوم مراد لیا جائے کہ اس آیت کے مخاطب خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں ہے۔ اس لئے کہ جب قرآن مجید میں حضورؐ کو یہ تلقین فرمایا گیا کہ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا۔ "اے نبی! آپؐ دعا کیجئے کہ اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما" ...... تو علم تو کُل کا کُل توحید ہی ہے۔ میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ علم ہو، فکر ہو، عمل ہو، اخلاق ہو، ان چاروں میں جو بھی خیر ہو وہ توحید ہی کا ثمرہ ہوگا۔ ان چاروں میں کجی اور زیغ کا جو بھی پہلو ہوگا وہ یقیناً شرک ہی کا شاخسانہ ہوگا۔ اس کجروی کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں شرک سے جا ملیں گے...... تو اس پہلو سے یہاں مفہوم یہ ہوگا کہ۔ اے نبی! آپؐ توحید پر اپنے یقین کو خوب پختہ کیجئے اور اس پر مضبوطی سے قائم رہئے۔

ایک حدیث سے استدلال ۔ اس بات کو ایک حدیث سے سمجھئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے قیامت کے دن حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا...... اور اس موقع پر میں جو اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کروں گا، وہ آج بیان نہیں کر سکتا، ...... اس بات کو سمجھئے۔ مراد یہ

com

ہے کہ اُس وقت عالمِ آخرت میں حضورؐ کو معرفتِ رب حضورؐ کی معرفتِ ربانی کا جس درجے حاصل ہوگی' وہ اس وقت نہیں ہے...... اور ظاہر ہے کہ انسان کسی کی حمد اس کی معرفت کے تناسب سے ہی کر سکتا ہے۔ جس کی جتنی معرفت آپ کو حاصل ہوئی اور جتنی کسی کی عظمت آپ نے پہچانی 'اُسی اعتبار سے آپ اس کی حمد کر سکیں گے۔ اور اس انکشافِ معرفت کے بے شمار مراتب ہیں۔ پھر ہر فرد کے اندر انکشافِ معرفت کے ارتقاء کا عمل بھی جاری رہتا ہے...... قرآن مجید کی عظمت آج جتنی آپ پر منکشف ہوئی ہے' ہو سکتا ہے کہ ایک سال بعد اللہ تعالیٰ آپ کے فہم میں مزید ترقی عطا فرمائے اور قرآن کی عظمت کے مزید پہلو آپ پر منکشف ہو جائیں۔ اسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ کی معرفت کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی معرفت کا انکشاف تو ہر دم مجھ پر ہو رہا ہے وہ تو مجھے ہر دم اور مل رہی ہے۔ اور اس میں تو ہر لحظہ اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے...... چنانچہ قیامت کے دن میں اللہ تعالیٰ کی جو حمد کروں گا' وہ حمد آج نہیں کر سکتا اس لئے کہ اُس وقت معرفتِ الٰہی اپنے آخری اور تکمیلی مرحلہ تک پہنچ چکی ہوگی۔

مغفرتِ ذنب۔ آگے چلئے فرمایا۔ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِکَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِؕ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مُتَقَلَّبَکُمْ وَمَثْوٰکُمْ ○ "اور اے نبی اپنی خطا یا اپنے گناہ یا اپنے قصور کے لئے معافی مانگو۔" یہ بڑا نازک مضمون ہے۔ الفاظ قرآنی کے ترجمے میں تبدیلی چونکہ مناسب نہیں ہے لہٰذا 'ذنب' کے جو لفظی ترجمے ممکن ہو سکتے تھے وہ میں نے بیان کئے ہیں۔ یہ مضمون زیادہ وضاحت کے ساتھ سورۃ الفتح میں آئے گا' جو سورۂ محمدؐ کے متصلاً بعد ہے۔ مفصل گفتگو وہیں ہوگی تاہم یہاں اجمالاً وضاحت کئے دیتا ہوں - - - - اس ضمن میں ایک اصولی بات پیش نظر رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خطا' گناہ یا قصور کو اپنی خطا' اپنے گناہ اور اپنے قصور پر ہرگز قیاس نہ کیجئے گا ع "گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی"...... یہ معاملہ نوعیت کے اعتبار سے بہت ہی مختلف ہے۔

نہایت عمدہ تاویل۔ اس مسئلہ پر بہترین رائے وہ ہے جو مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اپنی تفسیر میں بیان کی ہے۔ مولانا کی جن تفسیری آراء سے مجھے اختلاف ہے' وہ بھی آپ حضرات جانتے ہیں' لیکن ان کی تفسیر میں جو باتیں نہایت وقیع اور قابلِ قدر ہیں' ان کو بھی میں بیان کیا کرتا ہوں...... میں مولانا کی رائے اپنے الفاظ میں آپ حضرات کے سامنے رکھ رہا

© rasailojaraid.com

ہوں...... یہ بات اگر پیشِ نظر رہے تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور اس میں کوئی پیچیدگی اور الجھن نہیں رہتی ' کہ نبی سے جو خطا ہوتی ہے وہ جانبِ نفس میں نہیں ہوتی بلکہ جانبِ خیر ہی میں ہوتی ہے۔ ہماری خطا نفسانیت کی بنیاد پر ہوتی ہے جبکہ نبی کے ضمن میں اس کا دُور دُور تک امکان ہی نہیں ہوتا...... نبی سے اگر خطا ہوتی ہے تو خیر کی طرف ہوتی ہے یہ ہے مولانا کی رائے......

آپ حضرات حیران ہوں گے کہ "خیر کی طرف خطا" بڑی عجیب بات ہے!۔ میں اس کی وضاحت کیے دیتا ہوں کہ خیر کے معاملہ میں بھی ایک توازن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اگر اس معاملے میں حدِ اعتدال اور حدِ توازن سے تجاوز ہو جائے تو وہ بھی خطا ہی کی ایک صورت بن جاتی ہے۔ نبی کا معاملہ اصلاً اسی نوعیت کا ہوتا ہے کہ خیر میں اعتدال سے تجاوز ہو جاتا ہے جسے قرآن خطا سے تعبیر کرتا ہے۔ جیسے کسی وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت و شفقت کا اتنا غلبہ ہو گیا کہ آپؐ منافقین کے جرائم کو بھی آسانی سے معاف فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ٹوک دیتا ہے کہ آپؐ کیا کر رہے ہیں! آپؐ کی رحمت ' شفقت اور مودّت کے حق دار یہ لوگ نہیں ہیں ' یہ تو اہل ایمان کا حق ہے۔ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ ۔ "اے نبی! ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجئے ' اور ان پر سختی کیجئے"...... اب یہاں دیکھئے کہ شفقت و رحمت ہے تو خیر ہی ہے ' لیکن اس رحمت و شفقت میں تجاوز ہو گیا ہے تو اس پر ٹوک دیا گیا۔

سورۂ عَبَسَ سے استدلال۔ اسی طریقہ سے جب حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے کہ وہ ایک بار آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس وقت رؤساء قریش آئے ہوئے تھے ' ان سے گفتگو ہو رہی تھی۔ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ نابینا تھے اس لئے وہ نہ دیکھ سکے کہ حضورؐ کن لوگوں سے مصروفِ گفتگو ہیں! وہ بار بار آپؐ کی توجہ اپنی طرف منعطف کرانے کی کوشش کرنے لگے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی یہ حرکت ناگوار گزری اور آپؐ کے ماتھے پر بل پڑ گئے...... اللہ کی جانب سے فوراً گرفت ہوئی ' وحی نازل ہو گئی۔ عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی ○ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ○ وَ مَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰۤی ○ اَوْ یَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی ○ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ○ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ○ وَ مَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰی ○ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰی ○ وَ هُوَ یَخْشٰی ○ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ○ كَلَّاۤ اِنَّهَا

تَذۡ کِرَۃٌ ○ فَمَنۡ شَآءَ ذَ کَرَہٗ ○ ...... بڑا تیکھا اور سخت انداز ہے لیکن یہاں ذرا سوچئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان رؤساءِ قریش سے کوئی ذاتی غرض تو نہیں تھی۔ حضورؐ کا ان کی طرف التفات تو صرف اس لئے تھا کہ اگر ان میں سے کوئی ایمان لے آئے تو اس وقت جو اہلِ ایمان قریش کے ظلم و ستم کی چکّی میں پس رہے ہیں ' ان کو کچھ سہولت حاصل ہو جائے گی۔ اسلام کی دعوت کی توسیع کا راستہ کھل جائے گا۔ معاذاللہ آپ کی کوئی ذاتی غرض تو تھی نہیں لیکن اس طلبِ خیر میں ' دین کی مصلحت میں اتنا تجاوز ہو گیا کہ ایک صحابیؓ جو حضورؐ کی خدمت میں آئے تھے اور آپؐ کے التفات کے خواہش مند تھے ' ان کی ذرا سی حق تلفی ہو گئی۔ تو اس پر اس قدر سخت انداز میں گرفت ہو گئی۔ چنانچہ اس تاویل کی روشنی میں کہ نبی کی خطا نفسانیت کی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ جانبِ خیر ہی میں ہوتی ہے۔ یہ مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو جاتا ہے۔ اکثر مفسرین اس مسئلہ میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ یا تو نبی کے لئے خطا کا سرے سے انکار کر دیں۔ لیکن خطا کا انکار ازرُوئے قرآن مجید ممکن نہیں۔ آخر حضرت یونس علیہ السلام سے کوئی خطا ہوئی تھی جب ہی تو ان کوؑ مچھلی کے پیٹ میں ڈالا گیا اور وہاں انہوںؑ نے یہ تسبیح پڑھی لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنۡتَ سُبۡحٰنَكَ اِنِّیۡ كُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ تو انؑ کی توبہ قبول ہوئی اور وہؑ وہاں سے نکالے گئے[۱] اب اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ نبی سے کسی

۱ـ کسی نبی یا رسول کی شان کے لائق نہیں ہے کہ جس قوم یا بستی کی طرف ہدایت کے لئے مبعوث کئے گئے ہوں ' اُس قوم کو اللہ کا حکم آئے بغیر چھوڑ دیں۔ حضرت یونس علیہ السلام نے بُت پرستی کی مذمّت اور توحید کی دعوت و تبلیغ میں دن رات ایک کر دیا ' لیکن قوم انکار پر اڑی رہی اور اُن کا عناد و تمرّد ترقی کرتا رہا۔ حضرت یونسؑ غیرت و حمیت دینی سے اتنے مغلوب ہوئے کہ وحی کا انتظار کئے بغیر غصّہ میں آکر اور بد دعا دے کر قوم کو چھوڑ کر نکل گئے۔ اس تقصیر پر گرفت ہو گئی اور آں جنابؑ کو اللہ کے حکم سے ایک مچھلی نے نگل لیا۔ جہاں سے توبہ کے بعد نجات ملی۔ یہاں یہ ذکر بھی مناسب ہو گا کہ آں جنابؑ کی بد دعا کے نتیجہ میں جب عذاب کے آثار شروع ہوئے تو بستی والوں نے صدق دل سے توبہ کی ' بُت توڑ دیئے اور توحید پر ایمان لے آئے۔ اللہ تعالیٰ نے آنے والا عذاب ان پر سے اٹھا لیا۔ یہ واحد قوم ہے جس نے عذاب کے آثار دیکھ کر توبہ کی اور وہ اللہ تعالیٰ نے عذاب ٹال دیا۔ اسی کا ذکر ہے سورہ یونس کی اس آیت میں: فَلَوۡ لَا كَانَتۡ قَرۡيَةٌ اٰمَنَتۡ فَنَفَعَهَاۤ اِيۡمَانُهَاۤ اِلَّا قَوۡمَ يُوۡنُسَ ۚ لَمَّاۤ اٰمَنُوۡا كَشَفۡنَا عَنۡهُمۡ عَذَابَ الۡخِزۡىِ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَمَتَّعۡنٰهُمۡ اِلٰى حِيۡنٍ (آیت ۹۸)

© rasailojaraid.com

بھی نوع کی خطا ہوتی ہی نہیں تو دور از کار تاویلات کا سہارا لینا پڑتا ہے پھر بھی بات نہیں بنتی۔ کچھ لوگ اس معاملہ میں ایسی جسارت کرتے ہیں کہ انبیاءؑ کے لئے گستاخانہ اور توہین آمیز انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان یہی بات حقیقت کے قریب معلوم ہوتی ہے کہ نبی کی خطا جانبِ نفس اور جانبِ شر میں نہیں ہوتی بلکہ جانبِ خیر میں یا غیرت و حمیّتِ دینی کی بنا پر ہوتی ہے یا خیر ہی کے معاملے میں اُن سے حدِ اعتدال سے کچھ تجاوز ہو جاتا ہے جسے ان کی خطا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس تمام بحث کو ذہن میں رکھ کر آیتِ مبارکہ کے مطالعہ کی طرف رجوع کیجئے فرمایا فَاعْلَمْ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِکَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ والمومنت "پس جان لیجئے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور آپؐ اپنی خطا کے لئے استغفار کیجئے اور اہلِ ایمان مردوں اور عورتوں کے لئے بھی" ...... اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ اس موقع پر حضورؐ کے وہ بعض ساتھی جن کی طرف سے ذرا سی کمزوری کا اظہار ہوا تھا وہ منافق نہیں تھے' اہلِ ایمان تھے ...... ہاں ان کی طرف سے اللہ تعالیٰ پر توکل اور اعتماد کے معاملے میں جو کمزوری ظاہر ہوئی ہے تو ان کے بارے میں حضورؐ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ بارگاہِ الٰہی میں ان کے لئے بھی استغفار کیجئے ...... آگے فرمایا۔ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مُتَقَلَّبَکُمْ وَمَثْوٰکُمْ ○ "اور اللہ خوب جانتا ہے تمہارے متقلّب کو اور تمہارے مثویٰ کو"۔

'متقلّب' اور 'مثویٰ' کا مفہوم : گرامر کے اعتبار سے لفظ متقلب کے دو امکانات ہیں۔ یا تو یہ اسم ظرف ہے۔ تقلب کہتے ہیں چلنے پھرنے اور الٹ پھیر کو۔ "مقلّب" وہ مقام ہے جہاں انسان آتا جاتا رہتا ہے۔ مراد ہے یہ دنیا۔ دنیا میں بھاگ دوڑ اور چلنے پھرنے کا چکر چلتا رہتا ہے۔ آج یہاں جا رہے ہیں' کل وہاں جا رہے ہیں۔ آج لاہور میں ہیں تو کل کراچی میں یا کسی بیرونی ملک میں۔ چنانچہ کاروبار' حصول تعلیم اور حصولِ ملازمت کے لئے انسان دنیا کے مختلف حصوں میں آتا جاتا رہتا ہے۔ تو یہ دنیا" "متقلّب" ہے ...... اور "مثوی" کے معنی ہے لوٹنے کی جگہ' یعنی ٹھکانا ...... متقلّب کے لئے دوسرا امکان یہ ہے کہ یہ مصدر میمی ہے۔ بہرحال آیت کے اس حصہ کے یہ معنی لئے گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ اس دنیا میں تمہاری بھاگ دوڑ کہاں کہاں ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ بھی جانتا ہے کہ تم میں سے کس کا مستقل ٹھکانا کہاں ہے ......! دنیا میں تم کہیں بھی بھاگ دوڑ

com

کرتے رہو، تمہیں اپنے مستقل ٹھکانے کی طرف آخر کار لوٹنا ہے جو یا جہنم ہے یا جنت..... اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ ابو جہل کا ٹھکانا جہنم کے کون سے طبقہ میں ہے اور عبد اللہ ابن ابی کا ٹھکانا دوزخ کے کون سے گوشے میں ہے۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ...... اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقام علیین کے کون سے مرتبہ میں ہے۔ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِی عِلِّیِّیْنَ وَمَا اَدْرٰکَ مَا عِلِّیُّوْنَ ○ اور جنت الفردوس میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کون سا مقام ملنے والا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ یہ ہے مفہوم آیت کے ان الفاظ مبارکہ کا وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مُتَقَلَّبَکُمْ وَمَثْوٰىکُمْ ○

ایک چہ میگوئی اور اس کا جواب

اگلی آیت قدرے طویل آیت ہے اور اس میں بہت سے اہم مضامین آئے ہیں، اس لئے اسے ہمیں حصوں میں سمجھنا ہو گا۔ ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ غزوۂ بدر سے قبل مشاورت میں لشکر کی جانب چلنے کا فیصلہ ہو گیا تھا لیکن اس کے بعد کچھ ضعیف الایمان مسلمانوں کی طرف سے چہ میگوئی شروع ہوئی پہلے اس کا ذکر فرمایا: وَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَۃٌ۔ " اور کچھ اہل ایمان کہتے ہیں کہ کوئی سورۃ کیوں نہیں نازل ہوتی!"۔ پہلے تو یہ بات نوٹ کیجئے کہ ایسے لوگوں کو اہلِ ایمان کہا گیا ہے، منافق نہیں کہا گیا..... ویسے فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ ' اسی آیت میں آگے آ رہا ہے۔ لیکن یہاں انہیں مومن ہی کہا گیا ہے۔ کچھ ضعف اور کم ہمتی کا اظہار تو ہوا ہے لیکن دین سے خارج تو نہیں ہو گئے۔ دوسری بات یہ کہ ان کے اس قول کا کہ " لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَۃٌ " مطلب یہ تھا کہ اگر لشکر کا مقابلہ کرنا اور جنگ کرنا ہی منشاءِ الٰہی ہے تو کوئی سورۃ کیوں نہیں نازل ہو جاتی جس میں اس بات کا واضح حکم ہو۔ ایسا اہم فیصلہ اپنے اجتہاد سے کیوں کیا جا رہا ہے! آخر سارے خطرات تو ہماری جانوں پر آئے ہیں۔ آپؐ اللہ کے نبی اور رسول ہیں اگر وحی کے ذریعہ سے اس قتال کا واضح حکم آ جاتا تو ہم دل و جان سے حاضر ہیں۔

میں نے یہ پس منظر اس لئے قدرے تفصیل سے آپ کے سامنے بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ پر واضح ہو جائے کہ یہ جنوں، دیوؤں یا پریوں کی کہانیاں نہیں ہیں۔ یہ اسی نوع کے حالات و واقعات ہیں جو دنیا میں ایسے مواقع پر پیش آیا کرتے ہیں۔ اور آئندہ جب بھی

© rasailojaraid.com

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ 'تجدیدِ دین' اسلامی انقلاب کی منہاجِ نبویؐ پر کوئی زبردست تحریک برپا ہوگی تو ایسے حالات و واقعات سے سابقہ پیش آکر رہے گا۔ دینی تحریک میں جہاں ایسے لوگ بھی ہوں گے کہ جن کی کیفیت یہ ہوگی کہ "ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم" وہاں ایسے بھی ہوں گے جن کا حال یہ ہوگا یُسَاقُوْنَ اِلَی الْمَوْتِ وَھُمْ یَنْظُرُوْنَ (الانفال) مارے باندھے کو جا تو رہے ہوں گے لیکن اس طرح جیسے کسی کو پیچھے سے دھکیلا جارہا ہو اور اُسے موت سامنے نظر آرہی ہو۔ اس کا ایک نقشہ اسی آیت میں آگے آئے گا...... تو ہر طرح کے لوگ ہر دور میں پائے گئے اور ہر دور میں پائے جائیں گے۔

چوتھی بات یہ نوٹ کر لیجئے کہ یہاں سورہ سے مراد ایک آیت بھی ہو سکتی ہے اور اسی آیت میں آگے لفظ قتال آرہا ہے' اسی کی مناسبت سے اس سورہ کا نام سورۃ القتال بھی ہے۔ ویسے اس کا مشہور و معروف نام سورۂ محمدؐ ہی ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ میں یہ بات درس کے آغاز پر تفصیلاً عرض کر چکا ہوں۔

قتال کا حکم آنے کے بعد صورتِ حال

آگے چلیے فرمایا: فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَۃٌ مُّحْکَمَۃٌ وَّذُکِرَ فِیْھَا الْقِتَالُ "لیکن جب ایک محکم سورت نازل کر دی گئی جس میں جنگ کا ذکر ہے"...... جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہاں سورہ سے مراد آیت ہے۔ یہاں محکم آیت سے مراد سورۃ البقرہ کی یہ آیت ہو سکتی ہے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ وَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ "اے مسلمانو! اب تم پر جنگ فرض کر دی گئی ہے وہ تمہیں ناگوار گزر رہی ہے' ہو سکتا ہے کہ جو چیز تمہیں ناگوار ہو اسی میں تمہارے لئے خیر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ جو چیز تمہیں پسند ہو' اس میں تمہارے لئے برائی ہو' شر ہو۔ اور اللہ خوب جانتا ہے تم نہیں جانتے"۔ تو اس آیت کو ذہن میں رکھئے پھر پڑھیئے فرمایا: فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَۃٌ مُّحْکَمَۃٌ وَّذُکِرَ فِیْھَا الْقِتَالُ "لیکن جب ایک محکم سورت نازل کر دی گئی جس میں قتال کا حکم تھا" رَاَیْتَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ یہاں یہ بات آگئی کہ "تو آپؐ دیکھتے ہیں ان

لوگوں کو جن کے دلوں میں روگ ہے"۔ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ نَظَرَ الْمَغْشِیِّ عَلَیْہِ مِنَ الْمَوْتِ...... میں نے سورۃ انفال کے یہ الفاظ آپ کو کئی بار سنائے کہ یُسَاقُوْنَ اِلَی الْمَوْتِ وَھُمْ یَنْظُرُوْنَ ○ بعینہٖ یہ نقشہ یہاں ہے...... ابھی تک تو دل میں ہو گا کہ ابھی کوئی آیت قتال کے لئے نہیں اتری۔ ابھی تو جنگ کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیصلہ اور فرمان ہے۔ ابھی تک تو ہمارے مابین ہی مشاورت میں قتال کی بات طے ہوئی ہے۔ لیکن جب قتال کی آیت بھی نازل ہو گئی تو معلوم ہوا کہ اب ساری امیدیں ختم...... اگر بچنے کے کچھ راستے تھے بھی تو وہ سب کے سب بند ہو گئے...... لہٰذا ان کی اس حالت پر تبصرہ فرمایا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ " (اے نبی!) آپؐ دیکھتے ہیں ان لوگوں کو جن کے دلوں میں روگ ہے وہ آپؐ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اس شخص کا سا دیکھنا جس پر موت کی غشی طاری ہو گئی ہو "۔ جس کی آنکھیں پتھرا گئی ہوں، خوف سے جس کی جان لبوں تک آ پہنچی ہو۔ اُس طریقہ سے آپؐ کو دیکھ رہے ہیں کہ اب تو کوئی چارہ نہیں رہا...... ہمارے پاس جو آخری عذر تھا، وہ ختم...... پہلو تہی کا جو راستہ تھا وہ بند...... اب ہر آس معدوم ہو گئی...... ان کی اس پوری کیفیت پر بطورِ انجام تبصرہ فرمایا فَاَوْلٰی لَھُمْ۔ "افسوس ہے بربادی ہے ان کے لئے"۔

بندۂ مومن سے کیا رویہ مطلوب ہے:

آگے فرمایا: طَاعَۃٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ...... سن رکھو کہ تم سے اطاعت مطلوب ہے۔ ہر حال میں حکم ماننا ہو گا۔ اور تمہاری زبان پر ایک ہی قولِ معروف ہونا چاہئے...... اس قول کا یہاں ذکر نہیں ہے لیکن سیاق وسباق اُس قول کی طرف رہنمائی کر رہا ہے کہ وہ قولِ معروف کیا ہے! وہ سورۃ البقرہ میں جو اس سورہ سے قبل نازل ہوئی ہے آ چکا ہے کہ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا "ہم نے سنا اور ہم نے مانا۔ ہم نے تسلیم کیا اور ہم نے اطاعت کی"...... اہلِ ایمان کا قول تو یہ ہے ــــــ اور اسی کے مطابق ان کا عملی رویہ ہونا چاہئے۔ بین السطور میں یہ بات فرمائی جا رہی ہے کہ جان لو کہ اگر تمہیں ایمان پسند ہے، ایمان عزیز ہے، ایمان محبوب ہے، آخرت مطلوب ہے، اللہ کی مغفرت درکار ہے، جنت میں داخلہ کی طمع ہے تو تمہارا رویّہ کیا ہو گا طَاعَۃٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ...... عملاً اطاعت کی روش اختیار کرو اور تمہاری زبانوں پر کبھی کوئی بہانہ، کوئی عذر، کوئی حیلہ اور کوئی ہیر پھیر کی بات نہ ہو

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

© rasailojaraid.com

بقیہ: تعارفِ کتب

مخصوص نظریات سے باہر نہ نکلنے کے باعث بھی زوردار استدلال پیش نہیں کر سکے۔ مثلاً اکثر جگہ وہ "ردِّ حدیث" اور "انکارِ سنّت" میں خلط مبحث کر گئے۔ جس کی مثالیں حصّہ پنجم میں بکثرت ہیں۔ بلکہ اپنے اسی خول سے نہ نکلنے کے باعث بعض جگہ نامناسب الفاظ بھی ان کے قلم سے نکل گئے ہیں مثلاً "تقلید جیسا مذموم لفظ" لکھنا (صد ۲۴) یا مثلاً پرویز اور صوفیاء کو ایک ہی پلڑے میں رکھنا (صد ۱۲) [اگر جاہل متصوفین کے بات کرتے تو بہتر ہوتا۔] اسی طرح نمازِ تراویح پر اعتراض (صد ۴۸) یا "حجرِ اسود کو چومنے کا عبث کام" لکھنا (صد ۸۲) چاہے الزامی جواب کے باعث ہی لکھا ہو۔ نرم سے نرم لفظوں میں بھی اسے سخت غیر محتاط رویّہ کہا جا سکتا ہے۔

بہرحال اپنے عیوب اور خامیوں کے باوجود کتاب قابلِ مطالعہ اور معلومات افزا ہے۔ خصوصاً اس کے حصّہ دوم، سوم اور ششم کا مطالعہ پرویز صاحب کی آراء و افکار (یا پرویزیت) کی جھلک دیکھنے کے لئے ایک آئینے کا کام دے سکتا ہے۔ ●●

بقیہ: حرفِ اوّل

کہ وہ ان حدود کے اندر اندر باہم مشورے سے اپنی ضرورت کے مطابق قانون سازی کر سکتے ہیں۔ اسی گھوڑے اور کھونٹے کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے کسی ایسے گھوڑے کی مثال ذہن میں لائیے جو کسی کھونٹے سے بندھا ہوا اور اس کی رسی اتنی طویل ہو کہ وہ دس میل کے نصف قطر میں گھوم پھر سکتا ہو۔ اب ظاہر ہے کہ اس دس میل نصف قطر کے علاقے میں گھوڑے کے لیے ہر طرح کی آزادی ہے۔ خواہ چلے پھرے یا پوری قوت سے دوڑ لگائے لیکن دس میل کی حدود سے باہر نکلنا اس کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ آزادی اور پابندی کا یہی امتزاج ہے جو اسلام میں نظر آتا ہے خواہ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی معاملات، مومن اللہ کے احکام کے کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ لیکن حدود اللہ کے اندر اندر اُسے پوری آزادی بھی حاصل ہے ؎

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گِل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

○○○○○○

(۱۰)

مؤلف: ڈاکٹر محمد رفیع الدین
مترجم: ڈاکٹر ابصار احمد

منشورِ اسلام

خالقِ حقیقی کی اہم ترین صفت

خالقِ حقیقی مطلق خیر اور حسن ہے۔ محبّت اور رأفت و رحمت اس کی بنیادی اور مرکزی صفت ہے۔ اس کی وہ تمام صفات بھی جن میں بظاہر ناپسندیدگی اور خفگی مثلاً غصّے، انتقام، تعذیب اور ہلاکت کا شمار ہوتا ہے، اس کی صفتِ رحمت ہی کے مختلف مظاہر ہیں جو محبّت اور رحمت کے تحت مناسب مواقع پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ صفات بھی اصلاً خیر و حسن ہی کی صفات ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قرآنِ حکیم میں سب سے اہم صفت رحمت بیان کی گئی ہے:

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ط (الانعام: ۱۲)

اُس نے اپنی ذات پر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ط (الاعراف: ۱۵۶)

اور میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔

خالقِ حقیقی انسانِ کامل یعنی ایمانی تقاضوں کو پُورا کرنے والی انسانی آبادی سے محبت کرتا ہے۔ یہ وہ نصب العینی انسانی سوسائٹی ہے جسے وہ دنیا میں تخلیق اور ارتقائی عمل کے نتیجے کے طور پر بنانا چاہتا ہے۔ انسانی اجتماع بتدریج ایک ارتقائی عمل میں سے گزرتے ہوتے اپنے بلند ترین ہدف تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ عمل مسلسل تخلیقی اور ارتقاء پذیر عمل ہے۔ اور خود خالق کائنات اپنی محبت و رحمت کا اظہار اس عمل کے ذریعے کر رہا ہے۔ اس کی صفتِ غضب بھی صفتِ رحمت کے تابع ہے۔ ذاتِ الٰہیہ کی وہ اہم فعلیت جسے ہم فطرت کی فعلیت کے طور پر جانتے ہیں، نہایت

© rasailojaraid.com